Al-Azhār

Volume 7, Issue 1 (Jan-June, 2021)

ISSN (Print): 2519-6707

Issue: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/article/view/49

URL: http://www.al-azhaar.org/index.php/alazhar/article/view/49

Article DOI: https://doi.org/ 10.46896/alazhr.v7i01.49

Title Inter Relation of Politics and Ethics in the Light of Islamic Thought

Author (s): Dr. Fayyaz Ahmad Farooq and Dr. Razia Shabana

Received on: 29 June, 2020

Accepted on: 29 May, 2021

Published on: 25 June, 2021

Citation: Dr. Fayyaz Ahmad Farooq and Dr. Razia Shabana, "Construction: Inter Relation of Politics and Ethics in the Light of Islamic Thought," Al-Azhār: 7 no, 1 (2021): 01-22

Publisher: The University of Agriculture Peshawar

Click here for more

سیاست اور اخلاق کا باہمی تعلق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں

INTER RELATION OF POLITICS AND ETHICS IN THE LIGHT OF ISLAMIC THOUGHT

*ڈاکٹر فیاض احمد فاروق
**ڈاکٹر رضیہ شبانہ

Abstract

State accopied a fundamental importance among social institution and its role has always been tignified to systemize ways of human livings. Administration has a peculiar status in state system and we found the concept of politics to run state administration. Basically the politics is such a system that cause government system and given means the solid methodology by which the government is run.Fundamently the government is the name of resposilities from which the ruler have to performed,How can the freedom….of rulers,we found codes;and The second is law. Implimentation of law to support in better political system but courtesy is the name of good manners in human character why which man can perform his duties well. So it was need of the hour that the relationship of a poluitics and ethics must be enalysed to verify that both are not separate concepts but interlink with each others. Health .in modern politicalsystem, discussing constitunal government adaptation of ethics must be included in political system.so that to make state strong and consolitade, it can be made beneficial for the…modern political and ethical valuesd.

Keywords: Akhlaq, , Politics and Ethics,Ethical values

*اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ علوم اسلامیہ، انسٹی ٹیوٹ آف سدرن پنجاب ملتان
**ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ علوم اسلامیہ، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان

تعارف

تمام معاشرتی اداروں میں ریاست کو کلیدی حیثیت حاصل ہے اور انسانی زندگی کو منظم طریقے سے گزارنے کے لیے ریاست کا کردار ہر دور میں مسلم رہا ہے۔ کسی بھی ریاستی نظام میں اس کا نظم و نسق بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور اسی ریاستی نظم و نسق کو منظم طریقے سے چلانے کے لیے ہمیں ریاستوں میں سیاست کا تصور ملتا ہے۔ بنیادی طور پر سیاست ایسی تنظیمی بالیدگی کا نام ہے جو نظم حکومت کو سموئے ہوئے ہے اور حکومت سے مراد وہ منظم طریقہ جس کے تحت ریاستی نظام کو چلایا جاتا ہے۔ حکومت بنیادی طور پر ایک سعادت اور ذمہ داری کا نام ہے جس سے حکمراں عہدہ برآں ہوتے ہیں۔

دنیا کی ہر سیاسی اور اجتماعی ہیئت کی ایک غرض ہوتی ہے جو اس کے کاموں اور کارناموں کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ یہ غرض ماحول کے تقاضوں، نیک ارادوں اور سچی امیدوں کو ایک نقطہ پر جمع کر دیتی ہے۔ سیاستدانوں کی وہ جماعت جو انسانی ہیئت کی غرض و غایت کا صحیح ادراک کر کے اپنی کوشش و کاوش سے اجتماعی ہیئت بناتی ہے، سیاست کی اصطلاح میں یہی حکومت و قیادت ہوتی ہے۔ گویا یہ وہ طاقت ہے جس کے ارادہ و کلام سے سیاست کی اجتماعی مشین چلتی ہے۔ چونکہ انسان اجتماعیت پسند ہے اور اجتماعیت میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس کو ایک حاکم چلاتا ہے اور رعایا کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتا ہے۔ لہٰذا یہ انسان کا فطری تقاضا ہے کہ وہ ایک نظم کے تحت زندگی بسر کرے اور نظم وضبط کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک حکومتی نظام ہو جس میں ہر ادارہ اپنے دائرہ حدود میں رہ کر کام کرے۔

کوئی بھی ادارہ اپنی ذمہ داریوں کو اس وقت تک پوری طرح ادا نہیں کر سکتا جب تک اسے اپنے فرائض کا تعین اور اپنی حدود کار اور طریقہ کار کا مکمل شعور اور آگاہی نہ ہو۔ اگر غور کیا جائے تو اسلامی ریاست انسانی معاشرے کو منظم و فعال، اس کی تعمیر و ترقی اور اسے درپیش تمام چیلنجز کو حل کرنے کی اصل ذمہ دار ہے۔ زمانی تغیر میں دراصل یہ صلاحیت اور قوت ووسائل صرف اور صرف مملکت ہی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی حدود میں رہنے والے تمام شہریوں کے حقوق کا تحفظ اور ان کے انفرادی و اجتماعی معاملات ومسائل کو انتہائی سرعت و فعالیت کے ساتھ حل کر سکے۔ ہمارے ملک پاکستان کو اس وقت ایک ایسے اعلیٰ عادل و امین حکمران، اعلیٰ قابل اعتماد شخصیت اور اعلیٰ منتظم کی ضرورت ہے جو ریاستی نظم و نسق میں مہارت رکھتا ہو، قومی و ملکی مسائل کو حل

کرنے میں ایک ویژن رکھتا ہو اور مغربی حکومتوں کی چالوں سے آشنا ہو، کیونکہ اسلامی مملکت یا کوئی بھی ایسی مملکت جو ملک میں قانون کی بالادستی کی خواہاں ہو اس کے لیے یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ اس مملکت کے حکمران، ارباب حل وعقد اور اس کے کارکنان وہ لوگ ہوں جو اپنی اپنی ذمہ داریوں کا بخوبی ادراک اور اس کا احساس رکھتے ہوں اور ان ذمہ داریوں کو حد درجہ ادا کرنے کے خواہش مند بھی ہوں۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کسی مملکت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کے کارکنان اور افسران کو جو ذمہ داریاں سپرد کی جارہی ہیں وہ ان کو بخوبی انجام دے سکتے ہوں۔ جس طرح اعلیٰ انتظامیہ اور حکومتی ارکان کے لیے لازمی ہے کہ وہ ان فطری صلاحیتوں کے حامل ہوں جو عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔ اسی طرح رعایا پر بھی یہ فرض ہے کہ وہ ایسے نمائندوں کو منتخب کریں جو ان مناصب کے اہل ہوں، دور جدید کے تقاضوں کو سمجھتے ہوں، ملکی وسائل کے بہتر استعمال کے بارے میں جانتے ہوں، اور قومی و ملکی مسائل کے خاتمے کے لیے ان کے پاس وسعت نظر، فکر و آگاہی، بہادری اور جوش و جذبہ ہو، تاکہ عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ کر کے ظلم و ستم کی اس فضاء کو ختم اور ریاستی امور کو بہتر سے بہتر انداز میں چلایا جا سکے۔

کسی بھی ریاستی نظام کو چلانے کے لیے قانونی تقاضوں کی ضرورت ہوتی ہے اور قانونی تقاضوں کی عملی تکمیل کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے لیے بنیادی ادارہ پارلیمنٹ کو تصور کیا جاتا ہے۔ ایک ایسا ادارہ جس میں منتخب عوامی نمائندے موجود ہوتے ہیں، جن کی ملکی حالات اور عوامی مسائل پر نظر ہوتی ہے۔ لہذا ملکی وسائل کے بہتر استعمال اور عوامی مسائل کے حل کے لیے پارلیمنٹ میں قانون سازی کرتی ہے اور اسی قانون سازی میں تمام قانونی تقاضوں کو بھی مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ریاستی نظام کو چلانے کے لیے جہاں قانونی تقاضوں کی ضرورت ہوتی ہے وہیں کچھ اخلاقی تقاضوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے، کیونکہ جب ہم ریاست کے قیام کی بات کرتے ہیں تو اس میں دینی، انتظامی اور اخلاقی ضرورت کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی مملکت کا قیام جس میں اخلاقی اقدار کے تحت ریاستی نظام کو چلایا جائے تاکہ رعایا بھی اخلاقی اقدار کے مطابق اپنی زندگی گزار سکے۔

ڈاکٹر محمود احمد غازی اخلاقی اقدار کے تحت ریاستی قیام کو ضروری سمجھتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

''اسلامی ریاست کا قیام ایک اخلاقی ضرورت بھی ہے کیونکہ اس کے بنیادی مقاصد میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ امت کی اخلاقی اور تہذیبی قدروں کے تحفظ اور بقاء کے لیے اقدامات کرے۔ امت مسلمہ کا اخلاقی معیار قائم

رکھنے کے لیے اسلام نے احتساب کا جو ادارہ قائم کیا ہے وہ انسانیت کی معاشرتی تاریخ میں واحد اور بے مثال جدت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی ریاست ایک معاشرتی تقاضا بھی ہے کیونکہ صرف یہی ایک تنظیم ہے جس کے ذریعے امت اپنے مقاصد وجود کو حاصل کر سکتی ہے امت یعنی اسلامی معاشر ہاور خلافتیعنی اسلامی ریاستدونوں ایک دوسرے کو سہارادیتے ہیں۔ امت کے بغیر خلافت کا تصور نہیں کیا جاسکتا اور خلافت کی عدم موجودگی میں کوئی ایسی مادی اور خارجی قوت باقی نہیں رہتی جو امت کی سالمیت کی ضمانت دے سکے"۔[1]

اسلامی ریاست کا اخلاقی وجود اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس میں ریاستی نظام کو بھی شریعت کے تابع بنایا جائے اور طرز زندگی میں قانون فطرت کو تسلیم کرتے ہوئے ریاستی قانون میں بھی اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنایا جائے۔ اس کے لیے قانونی جواز سے زیادہ اخلاقی اقدار اور اصولوں کو بھی مد نظر رکھا جائے تاکہ انسانی زندگی میں اس کی اخلاقی طاقت قانونی طاقت پر غالب آجائے۔ لہٰذا اس صورت میں آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی انسان کی عام تمدنی زندگی میں اسلامی معاشرہ دیگر معاشروں پر بھی غالب آسکتا ہے۔

سیاست میں اخلاقیات کا جائزہ لینے سے پہلے ضروری ہے کہ پہلے تصور اخلاق کی وضاحت کر دی جائے تاکہ اس بحث کو سمجھنا مزید آسان ہو جائے۔

اخلاق کا تعارف

جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے تو اخلاق خلق کی جمع ہے جس کے معنی اچھی عادات، تہذیب انسانیت، ملنساری، مروت کے ہیں، یعنی وہ علم جس میں تہذیب نفس اور معاشرتی معاملات کے اصولوں سے بحث ہوتی ہے۔[2]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تہذیب میں اچھے طور طریقوں کا اختیار کرنا، اس کے مطابق زندگی گزارنا اور عام معاشرتی معاملات کو اس کے مطابق ڈھالنا اور ایسا طریقہ وضع کرنا جو آپ کو تمام انسانوں سے ممتاز کر دے۔ اسی قسم کی وضاحت قرآن کریم میں نبی کریم ﷺ کے اخلاق کے بارے میں بھی ملتی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے کہ

وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ[3]

"اور تمہارے اخلاق بہت اعلیٰ ہیں"۔

جب ہم نبی کریم ﷺ کے اسوہ کی بات کرتے ہیں تو آپ کی پوری زندگی ہمارے لیے کامل نمونہ ہے۔ یہ اعلیٰ نمونہ آپ ﷺ کے اوصاف حمیدہ، عادات مطہرہ اور کمالات جلیلہ کی وجہ سے ہے۔

خلق کے ساتھ ساتھ قرآن کریم میں خلاق کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے یعنی وہ فضیلت جو انسان اپنے اخلاق سے حاصل کرتا ہے۔[4]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی ایسی عادات، طور اطوار اور کردار جس کی وجہ سے اسے فائدہ یا نقصان ہو یا وہ مقام و مرتبہ جو وہ اپنے کردار سے حاصل کرے۔ انسانی کردار کی تطہیر بھی اعلیٰ اخلاقی اقدار میں ہوتی ہے۔ جہاں تک فائدہ یا نقصان کا تعلق ہے تو یہ دنیاوی اور اخروی دونوں حوالوں سے شامل ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

ما لَهُ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ[5]

"ایسے لوگوں کا اخرت میں سے کچھ حصہ نہیں"۔

گویا اخلاق سے مراد کسی شخص کے کردار اور عادات کے ہیں۔ انسان کا کردار ہی اس کے لیے بھلائی یا برائی کا سبب بنتا ہے۔ اس سے مراد ایسا کردار بھی ہے، جس سے انسانی روح کی بالیدگی میں اس کا اثر نمایاں ہوتا ہے جس کے نتیجے میں انسان اچھے اعمال کی طرف راغب ہوتا ہے اور اخلاقی اقدار اور اخلاقی معیارات کی تنفیذ اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے۔ کردار کی پختگی میں ایسا نشو وارتقاء ہوتا ہے جس کی بنیاد پر اچھے اور برے کی تمیز سے روشناس ہو کر صرف اچھائی کی طرف راغب ہو جاتا ہے۔ اسی بات کی وضاحت ہمیں احادیث میں بھی ملتی ہے۔

جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

البر حسن الخق والاثم ماحاک فی صدرک وکربت ان یطلع علیه الناس[6]

"نیکی اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جو برے دل میں کھٹکے اور تو لوگوں کو اس پر باخبر ہونے کو ناپسند کرے"۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اخلاق سے ہی انسان کے کردار کی تطہیر ہوتی ہے اور یہ اخلاق انسان کے کردار پر اثر انداز ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی شخصیت میں اخلاق اور اخلاقی اقدار کی حیثیت مسلمہ ہے اور اس کی اہمیت ہمیں قرآن و حدیث میں بھی ملتی ہے۔

حدیث میں اخلاق کی اہمیت یوں بیان کی گئی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو ؓ قَالَ إِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا- [7]

"عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میں سے بہترین لوگ وہی ہیں جو اپنے

اخلاق میں دوسروں سے اچھے ہیں"۔

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: مَا مِنْ شَيْءٍ أَثْقَلُ فِي الْمِيزَانِ مِنْ حُسْنِ الْخُلُقِ۔ [8]

"ابو درداءؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن میزان میں کوئی چیز بھی اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی نہ ہو گی"۔

عنْ عَائِشَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ يَقُولُ: إِنَّ الْمُؤْمِنَ لَيُدْرِكُ بِحُسْنِ خُلُقِهِ دَرَجَةَ الصَّائِمِ الْقَائِمِ۔ [9]

"حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ بندہ مومن حسن اخلاق سے وہی درجہ حاصل کر لیتا ہے جو دن کے روزوں اور رات کی نمازوں سے حاصل ہوتا ہے"۔

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اخلاق کو بہت اہمیت دی گئی ہے، کیونکہ اخلاق اور اخلاقی اقدار سے انسانی سیرت کی پہچان ہوتی ہے۔

جہاں تک علم اخلاق کا تعلق ہے تو اس سے مراد وہ علم جو بھلائی اور برائی کی حقیقت کو ظاہر کرے اور اس کو بیان کرے کہ انسانوں کو آپس میں کیسے معاملہ کرنا چاہیے اور اس کو واضح کرے کہ لوگوں کو اپنے اعمال میں کس منتہائے نظر اور مقصد عظمیٰ کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور مفید اور کار آمد باتوں کے لیے دلیل راہ بنے۔ [10]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اخلاق کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

"خلق انسان کی اس کیفیت کا نام ہے جو اس کی طبیعت کے مختلف اوصاف کی جد وجہد کر کے اپنی جانب راجع کرے"۔ [11]

امام غزالی نے احیاء علوم الدین میں خلق کی بڑی عمدہ تعریف کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

"خلق نفس کی اس ہیت راسخہ کا نام ہے جس سے تمام افعال بلا تکلیف صادر ہوں اگر یہ افعال عقلاً اور شرعاً عمدہ اور قابل تعریف ہوں تو اس ہیت کو خلق نیک اگر برے اور قابل مذمت ہوں تو اس ہیت کو خلق بد کہتے ہیں"۔ [12]

گویا علم الاخلاق کا موضوع دو قسم کے اعمال پر مشتمل ہے۔

۱۔ وہ اعمال جو انسان کے اختیار و ارادہ سے صادر ہوتے ہوں اور عمل کے وقت جن کے بارے میں وہ خوب جانتا ہو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

۲۔ وہ اعمال جو عمل کے وقت اگرچہ بغیر ارادہ صادر ہوتے ہیں لیکن اختیار، شعور اور ارادہ کے وقت ان کے متعلق احتیاط برت سکتا ہے۔

اور یہی وہ اعمال ہیں جن پر خیر اور شر یا اچھے اور برے ہونے کا حکم لگایا جاتا ہے۔[13]

''نفس انسانی اپنے کردار میں تین امور میں سے کسی ایک امر سے متعلق ہوتا ہے۔ایک طبیعت، دوسرا حال اور تیسرا ملکہ ہوتا ہے۔طبیعت جبلت کا نام ہے جس میں تغیر و تبدل کا قطعی امکان نہیں، حال نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جس سے استبداد قبول کی بنا پر نفس متکیف ہوتا مگر جلد ہی زوال بھی قبول کر لیتا ہے، جب کہ ملکہ اس کیفیت یا قوت کا نام ہے جو نفس انسانی میں راسخ ہو جاتی ہے اور اس کا زوال ہو تو سکتا ہے لیکن بمشکل اور بتا خیر۔اس کے بعد یہ واضح ہے کہ خلق ان تینوں کیفیات میں سے نفس کی اس کیفیت سے متعلق ہے جو ملکہ کہلاتی ہے اور اس کا حال مزاج سا نہیں ہے۔لہذا علم الاخلاق کے ذریعے اس کی تہذیب واصلاح ممکن ہے''۔[14]

گویا علم الاخلاق سے مراد وہ انسانی اوصاف و کمالات اور کردار جس کے متعلق بحث کی جاتی ہے تاکہ ان اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت کی پہچان ہو سکے اور انھی اوصاف کی بنیاد پر انسانی شخصیت میں نکھار پیدا ہو جو انسانی شخصیت میں توازن کے معیار کو بھی برقرار رکھے۔

سیاست اور اخلاق کا تعلق

انسانی شخصیت کا یہ کمال ہے کہ یہ ہر اس انسان سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا جس کا معیار زندگی افراد معاشرہ سے ممتاز ہوتا ہے اور یہ بھی ایسے انداز میں زندگی گزارنا پسند کرتا ہے جس سے اس کی شخصیت میں نہ صرف نکھار آئے بلکہ معاشرے کے دیگر افراد بھی اس کی شخصیت سے متاثر ہو کر اپنی زندگی کو اس سانچے میں ڈھال لیں۔یہ بات واضح رہے کہ کچھ چیزیں انسانی فطرت میں ودیعت ہیں، جن کے مطابق انسان اپنی شخصیت میں نکھار پیدا کرتا ہے اور کچھ چیزیں انسانی حالات کے مطابق اختیار کرتا ہے۔ایسی چیزیں جو انسان کو مہذب زندگی گزارنے میں معاون و مددگار ہوتی ہیں۔جہاں تک انسانی طرز زندگی اور تہذیب و تمدن کا تعلق ہے تو انسان کی معاشرتی زندگی پر اس کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور پھر ان اثرات سے بھی متاثر ہو کر انسان اپنا طرز زندگی بدلتا رہتا ہے۔آہستہ آہستہ یہ تغیر بھی اس کے اقوال، افعال اور رہن سہن میں تغیر پذیر ہو جاتا ہے۔چونکہ فطری طور پر انسان منظم زندگی گزارنا پسند کرتا ہے کیونکہ انسان اجتماعیت پسند ہے اور اجتماعیت میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے ایک ایسے سیاسی نظام کی ضرورت ہوتی ہے جس کو ایک حاکم چلاتا ہے لہذا یہ بھی انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ ایک نظم کے تحت زندگی بسر کرے۔

''اگر فکری بنیادوں پر اس کا جائزہ لیا جائے تو ہم دیکھتے ہیں کہ جونہی معاشرہ وجود میں آتا ہے تو انسان کی

حیوانی فطرت ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس فطرت میں تشدد وعداوت بھی داخل ہوتی ہے جو اسے دوسروں سے نبرد آزما ہونے پر اکساتی ہے۔ اگر کوئی ایسا نظام کارفرما نہ ہوتو شاید انسان باہم جنگ وجدل کرتے ہی رہیں اور پھر ختم ہو جائیں۔ لہٰذا ایک ایسے نظام مملکت کی ضرورت پیش آتی ہے۔ جہاں ایک حاکم بھی ہو جو انسانوں کو لڑنے مرنے سے روک سکے"۔[15]

لہٰذا اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے معاشرتی اداروں میں ریاست سب سے اہم تصور کی جاتی ہے اور ریاست میں سیاسی نظام سب سے اہم ہے۔ اب جہاں تک سیاسی نظام کا تعلق ہے تو اس کا سارا دارومدار قانون اور قانونی تقاضوں کی عملی تکمیل پر ہوتا ہے۔ اور یہ تمام قوانین صرف ملکی نظم ونسق کے لیے وضع کیے جاتے ہیں۔ ان قوانین میں تطہیر فکر، معاشرتی تعمیر وترقی اور اخلاقی اقدار کو نہ صرف نظر انداز کر دیا جاتا ہے بلکہ ریاستی نظم ونسق میں اخلاق کی مسلمہ حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کیا جاتا، جب کہ اخلاق کی ایک مسلمہ حیثیت ہے جس سے کبھی بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

ہم ایک اسلامی ریاست میں رہتے ہیں اور اسلامی ریاست میں بعض ایسے کام یا قوانین جو قانونی طور پر تو درست ہوں مگر اخلاقی طور پر ان میں نقائص پائے جائیں تو قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقی تقاضوں کو پورا کرنے کی بھی ضرورت رہتی ہے اور اس بات کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ہمارے حکمرانوں اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے پاس اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ جس کام میں اخلاقی تقاضوں کی عملی تکمیل کی ضرورت پیش آجائے وہاں قانونی تقاضوں کے ساتھ ساتھ اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کو بھی ضروری سمجھا جائے۔ اس لیے وقتی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے تبدیلی بے حد ضروری ہے، اس لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہماری مزاجی کیفیت کو تبدیل کیا جائے اور سیاست میں ایسا نظام وضع کیا جائے جس کے تحت قانون سازی کرتے ہوئے اخلاقی اقدار کو بھی قانونی سانچوں میں ڈھال دیا جائے تاکہ قانونی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ اخلاقی تقاضوں کی بھی تکمیل ہو سکے۔ قانون کو اخلاق کے جزو کے طور پر پڑھا، سمجھا اور نافذ کیا جائے تاکہ سیاست حاضرہ کو صحیح معنوں میں اسلامی سیاست کے سانچوں میں بھی ڈھالا جاسکے۔ ہمارے حکمرانوں کی مزاجی کیفیت کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے جہاں قانونی تقاضوں کی تکمیل سے پہلے اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کر لی جائے تو اس کے نہ صرف ریاستی نظام پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ ریاستی نظم ونسق میں اخلاقی اقدار کا فروغ، سیاسی ومعاشرتی زندگی میں بہتری اور عام انسانی معاشرے کی مزاجی کیفیت کو بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

جب ہم ریاست، اس کے نظم و نسق اور قانونی تقاضوں کی بات کرتے ہیں تو کسی بھی ریاست کا بنیادی نظام میں راعی اور رعایا کے تصور سے مربوط ملتا ہے۔ یہ راعی اور رعایا ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم تصور کیے جاتے ہیں، جن کے مختلف حقوق و فرائض ہوتے ہیں۔ ان حقوق و فرائض کی تکمیل کے لیے قانون اور مختلف ضابطے وجود میں آتے ہیں پھر ان قانونی ضابطوں کا عملی نفاذ ہوتا ہے۔ آئین اور دستور کے ساتھ ساتھ کچھ مختلف معاشروں میں انسان کی مزاجی کیفیات ہوتی ہیں جن کا تعلق انفرادی اوصاف اور معاشرے کی عمومی کیفیت کے ساتھ مربوط ہوتا ہے اور یہ اوصاف اور اخلاقی اقدار نہ صرف قانونی تقاضوں کی تکمیل میں معاون ہوتے ہیں بلکہ انسانی شخصیت کی تکمیل اور معاشرے کی مزاجی کیفیت کو بدلنے میں بھی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ انھی اوصاف و کردار کی بنیاد پر عوام اپنے لیے بہترین نمائندوں کا انتخاب کرتے ہیں جو ریاستی نظام کو بھی چلاتے ہیں اور عوام کے بنیادی حقوق کا تحفظ بھی کرتے ہیں۔ اگر ہم نظام حکومت پر عمومی نظر ڈالیں تو کسی بھی ریاست میں حاکم کے پاس حکومت کرنے کے لیے دو وجوہات ہوتی ہیں۔

۱۔ ریاستی نظام کو چلانا ۲۔ مفاد عامہ کے لیے پالیسیاں بنانا اور ان پر عمل درآمد کرانا

ان دونوں عوامل کی تکمیل کے لیے ان حکمرانوں کو اختیارات دیے جاتے ہیں تاکہ وہ وقتی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے عوام الناس کی ضرورتوں کا خیال رکھ سکیں، ان کے لیے پالیسیاں وضع کریں اور پھر ان پالیسیوں پر عمل درآمد بھی کروا سکیں۔ ان پالیسیوں پر عمل کروانے کے لیے ایک طرف تو ان کے پاس قانونی قوت ہوتی ہے جس کا بر محل استعمال کیا جاتا ہے، دوسری سب سے اہم چیز انسانی اخلاق ہے اور وہ اخلاقی اقدار جو انسان کی شخصیت کو قانون پر عمل کرنے کے لیے نہ صرف اکساتی ہے بلکہ انسانی مزاج میں ایسی کیفیت پیدا کر دیتی جو انسان کو قانونی تقاضوں کی تکمیل سے زیادہ انسانی کردار کی تکمیل کے لیے آمادہ کرتی ہے۔ یہ مزاجی کیفیت انسانی شخصیت میں اعلیٰ صفات کے ساتھ ساتھ اسے قانون پر عمل درآمد کے لیے تیار کر دیتی ہے۔ نفاذ قانون کے لیے جہاں قانونی ضابطوں کی ضرورت ہوتی ہیں وہیں اخلاق اور اخلاقی اقدار کا ہونا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ اچھے حاکم کی پہچان بھی انھی اوصاف کی بنیاد پر ہوتی ہے جن اوصاف کے تحت وہ حکومتی نظام اور ریاستی نظم و نسق کو کنٹرول کرتا ہے۔

ریاستی نظام اور طرز سیاست سے متعلق ابن طباطبا لکھتے ہیں

"رعایا میں جتنی قسم کے لوگ ہوں اتنی ہی قسم کی ان کے لیے سیاست درکار ہے۔ اہل فضل کے ساتھ مکارم اخلاق اور لطیف انداز کی سیاست برتنی چاہیے۔ متوسط لوگوں کے لیے ایسی ترغیب والی سیاست درکار ہے جس

میں ترہیب بھی ملی ہو اور عوام کے ساتھ رعب و دواب والی سیاست ہونی چاہیے جس میں سیدھے طریقے کی بات ہو اور صحیح بات پر انھیں مجبور کیا جائے"۔[16]

وہ مزید لکھتے ہیں کہ

"فرمانروا کے لیے سیاست بھی درکار ہے، یہی فرمانروا کا راس المال ہے اس سے خون ریزی کی روک تھام اور مال کی حفاظت ہوتی ہے، عصمتوں کا تحفظ، شرارتوں کا سدباب، فسادات کا قلع قمع، ظلم کا انسداد، فتنوں اور بے اطمینانیوں کا علاج سب کچھ اسی کا صدقہ ہے"۔[17]

اس سے معلوم ہوا کہ ریاست اور حکومت کے لیے سربراہ کا ہونا بہت ضروری ہے، کیونکہ سربراہ ہی پورے نظام کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ اگر ہم اسلامی تعلیمات پر نظر ڈالیں تو سیاسی نظام کی عملی تکمیل کے لیے جس سیاست کا تصور ملتا ہے اس میں نظم حکومت کی کافی اہمیت بیان کی جاتی ہے۔ جس کا ایک سربراہ ہوتا ہے جو پوری ریاستی نظم و نسق کا جائزہ لیتا ہے اور عملی اقدامات کرتا ہے۔ ان عملی اقدامات میں جہاں وہ قانون اور قانونی تقاضوں کی تکمیل کو ضروری سمجھتا ہے وہیں اخلاق اور اخلاقی اقدار کو فراموش کر دیتا ہے۔ کیونکہ احساس ذمہ داری قانون سے زیادہ اخلاقیات کو اختیار کر کے کی جاسکتی ہے۔ جہاں تک حکومت کا تعلق ہے تو یہ بہت بڑی سعادت اور ذمہ داری تصور کی جاتی ہے اور قرآن کریم میں اس کو امانت بھی تصور کیا گیا ہے، گویا حکومتی عہدہ آپ کے پاس امانت ہے اور بہتر یہ ہے کہ اچھے انداز میں اس امانت سے عہدہ برا ہوا جائے۔ جب حکومت، حکومتی اختیارات اور اموال کدہ سب مسلمانوں کی امانت ہے تو اس امانت کو خدا ترس، ایماندار اور عادل لوگوں کے سپرد کرنا چاہیے تاکہ اس امانت کی عملی افادیت کو بھی سمجھا جاسکے۔

سیاست حاضرہ اور اخلاقی اقدار

دنیا بھر کے ترقی یافتہ ممالک میں کاروبار، تجارت اور سیاست ایک دوسرے سے الگ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پاکستان میں کاروباری افراد نے سیاست میں آنے کے بعد حکومتی اثرورسوخ کے ذریعے اپنے کاروبار میں اضافہ کیا اور اس مقصد کے لیے جہاں تک ہو سکا اختیارات کا بے جا استعمال اور اختیارات سے تجاوز کیا، خواہ ان کا تعلق صوابدیدی اختیارات سے ہو یا اختیار تمیزی سے ہو۔ حکمران و انتظامیہ اسے اپنا حق سمجھتے ہوئے ملک و قوم کو اخلاقی اور قانونی طور پر زچ پہنچاتی رہی ہے۔ جہاں تک اختیارات کے غلط استعمال کا تعلق ہے تو حکمران ان کا استعمال مختلف طریقوں سے کرتے رہے ہیں اور اس استعمال کی نوعیت بھی مختلف ادوار میں مختلف رہی ہے۔ چونکہ

حکمرانوں کا زیادہ زور دولت کے حصول میں رہا ہے اس لیے ہر دور میں اس کو حاصل کرنے کے وہ تمام ذرائع اختیار کیے جاتے رہے ہیں جو ان کے دائرہ اختیار میں ہوتے تھے ،بالخصوص بیت المال کا غلط استعمال اور بنکوں سے قرضے اور غیر قانونی اجازت نامے بھی شامل ہیں جس کی وجہ سے ان کاروباری سیاستدانوں نے معاشی اور صنعتی میدانوں میں بھی خوب ترقی کی۔یہی وجہ ہے کہ ان کی ترقی میں ان تمام افراد نے بھی فائدہ اٹھایا جو کسی نہ کسی صورت میں ان کی انتخابی مہموں کے کرتا دھرتا ہوتے تھے،جن کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جاتا رہا ہے،اہلیت کی تمام قانونی رکاوٹوں کا غلط استعمال کیا جاتا رہا ہے اور حکمرانوں کی نوازشیں سر عام برستی رہی ہیں۔

قیام پاکستان سے لے کر آج تک سیاست اورکاروبارکا چولی دامن کا یہ ساتھ اب تک لازم وملزوم بنا ہوا ہے۔چونکہ کاروبار کا مفاد سیاست سے ہے اور سیاست کا مفاد کاروبار سے وابستہ ہے اس لیے سیاستدانوں اور کاروباری افراد نے ذاتی مفاد کے لیے دونوں میدانوں میں قدم جما رکھا ہے۔چناچہ سیاست میں کاروباری افراد کی آمد کا آغاز قیام پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہوگیا تھا۔ یوسف ہارون سندھ کے پہلے وزیراعلیٰ تھے جو صنعتی یونٹوں کے مالک تھے۔اسی طرح بہت سے اور کاروباری افراد احمد داؤد، ناصر اے شیخ، اے کے سومرو، احمد قادر اور رفیق سہگل قیام پاکستان کے بعد تعلقات اور سیاسی فیصلوں کی بناءپر اعلیٰ حکومتی عہدوں پر فائز رہے اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔جنرل ضیاءالحق نے پہلی بار بہت زیادہ تعداد میں کاروباری افراد کو سیاست سے وابستہ کیا اور سیاست دانوں کو کھل کر کاروبار کرنے کے بھی مواقع فراہم کیے۔[18]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سیاست وحکوت جو کہ ایک ذمہ داری تھی ہمارے حکمرانوں نے اس کو انا پرستی، حصول دولت ،اقربا پروری، قانون کے نام پر مفادات کا حصول،اختیارات سے تجاوز ،ناجائز اختیارات کا استعمال،عہدوں کی بنیاد پر جرائم اور جرائم میں ملوث افراد کی سرپرستی عام سی بات سمجھی جاتی رہی ہے۔حکومتی ارکان جو خود کو عوامی نمائندے اور خدمت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز کرتے نظر آتے ہیں،حقیقت میں وہ ذاتی مفادات کے حصول میں جھوٹ،دھوکہ دہی اور اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو گئے ہیں۔اور احساس ندامت کی بجائے وہ اس پر فخر کرتے نظر آتے ہیں۔حکمرانوں،عوامی نمائندوں اور قائدین ک تذکرہ کرتے ہوئے ابن طباطبا ابن مقنع کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ

"فرمانروا کو کبھی غصے میں نہیں آنا چاہیے،کیونکہ طاقت اس کی اپنی ضرورت کے تابع ہوتی ہے۔اسے جھوٹ

بھی نہیں بولنا چاہیے، اس لیے کہ اس کی اپنی مرضی کے خلاف کوئی بھی اسے مجبور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ اسے بخیل بھی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ محتاجی کا اندیشی اسے برائے نام ہی ہوتا ہے۔ اسے کینہ پرور بھی نہیں ہونا چاہیے اس لیے کہ اگر اس سے کوئی برائی سرزد ہو تو کوئی دوسرا اسے سزا نہیں دے سکتا۔ اسے بات کرتے وقت قسمیں بھی نہیں کھانی چاہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ قسم کھانے کی ضرورت انسان کو اس وقت پیش آتی ہے جب اسے اپنے اندر کوئی کمزوری محسوس ہو یا اسے اس کی ضرورت محسوس ہو کہ لوگ اسے سچا سمجھیں گے یا وہ اظہار مافی الضمیر پر قادر نہ ہو اور وضع دار بات نہ کر سکے۔ ان تمام صورتوں میں وہ قسم کو اپنی بات کا تتمہ یا تکیہ سخن بناتا ہے۔ اور کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ اسے علم ہوتا ہے کہ لوگ اسے عام طور پر جھوٹا سمجھتے ہیں اس لیے وہ گویا اپنے آپ کو اس پوزیشن میں محسوس کرتا ہے کہ بغیر قسم کھائے لوگ اس کی بات کو درست نہیں سمجھیں گے۔ فرمانروا کو تیز مزاج بھی نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ تیز مزاجی کی وجہ سے بعض ایسی باتیں سرزد ہو جاتی ہیں جن پر ندامت ہوتی ہے"۔[19]

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا حکمران کو کیسی صفات کا حامل ہونا چاہیے، اس کا طرز حکومت کیسا ہونا چاہیے، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے حکمرانوں کی ترجیحات بدل چکی ہیں عہدے جو کہ ذمہ داری کی مثال سمجھے جاتے تھے اب اس ذمہ داری کو اپنا حق تصور کر لیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے حکمران اپنے حقوق کے حصول میں اپنے فرائض کو بھول جاتے ہیں۔ فرائض کی تکمیل میں اخلاقی تقاضے تو دور قانونی تقاضے بھی پورے نہیں کرتے وہ صرف قانون اور نفاذ قانون کی بات جبکہ وہ عملی طور پر قانونی تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان سب باتوں کو بھول جاتے ہیں۔ لہذا دور جدید میں یہ حکمرانوں کا طرز سیاست بن گیا ہے کہ جو ان کے اخلاقی فرائض ہوتے ہیں ان کو پورا کرنے کی بجائے وہ اخلاق اور سیاست کو الگ الگ پیمانوں میں رکھنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ چناچہ جب حکمرانوں کی ترجیحات بدل جائیں اور وہ عوام الناس کے حقوق کو پورا کرنے کی بجائے صرف اپنی ذات کے فائدے تک محدود ہو جائیں۔ بیت المال جس کی حفاظت کا ذمہ بھی ان حکمرانوں پر ہو وہ نہ صرف اس کا غلط استعمال کریں بلکہ اس پر فخر بھی کریں اور اچھی انتظامیہ ہونی کی اشتہاری مہم بھی چلائیں اور اس کے برعکس عوام کی خوش حالی کے سب دعوے ویسے کے ویسے رہیں تو پھر ایسی قومیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں۔ بطور مسلم ہم اسی وقت ترقی کر سکتے ہیں جب تک ہم نہ صرف قانون اور قانونی تقاضوں کی تکمیل کریں بلکہ اخلاقی تقاضوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ قانونی مساوات کا بھی خیال رکھیں۔

کسی بھی جمہوری نظام کی معراج یہ ہے کہ حکمران اپنے ذاتی حقوق و معاملات میں ایک عام آدمی کے

مساوی ہوں اور اسے کسی قسم کا امتیاز حاصل نہ ہو بلکہ قانون سب کے لیے بابر ہونا چاہیے اور حکمرانوں کو اس کے نفاذ خود پر بھی کرنا چاہیے اور حقوق کی ادائیگی میں بھی مساوی طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ گویا حاکم اور رعایا میں کوئی فرق نہیں ہونا چاہیے اور خصوصی اختیارات کی مد میں حکمران کچھ حاصل کرے تو اس پر بھی اس کی گرفت ہونی چاہیے اور یہ بات قانونی اور اخلاقی طور پر معیوب نہیں سمجھنی چاہیے کیونکہ نبی کریم ﷺ کے اسوہ سے ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ

مرت ابل الصدقة على رسول اللهﷺ قال: فاهوى بيده الى وبرة من جنب بعير فقال: ما انا با حق بهذه الوبرة من رجل من المسلمين۔[20]

''ایک مرتبہ بیت المال کے صدقہ کے کچھ اونٹ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے گزر رہے تھے، نبی کریم ﷺ نے ایک اونٹ کے پہلو سے اپنے ہاتھ سے اس کی اون پکڑی اور فرمایا کہ میں ایک عام مسلمان کی نسبت اس اون کا بھی کوئی زائد استحقاق نہیں رکھتا''۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکمران اور سرکاری افسران، سرکاری املاک کے سلسلہ میں ایک ملک کے عام باشندہ کی طرح ہیں، انہیں اس میں ناحق و بے جا تصرف کرنا اور دوسروں کے مقابلہ میں اپنے آپ کو ترجیح دینا جائز نہیں، جیسا کہ آج کل حکمران اور سرکاری افسران شاہ خرچیاں کرتے اور سرکاری اموال واشیاء روپیہ پیسہ، بجلی، ٹیلی فون، گیس اور دیگر چیزوں میں مال مفت، دل بے رحم کا کردار ادا کرتے ہیں۔ لہذا یہ بات نہ صرف قانونی طور پر درست نہیں بلکہ اخلاقی لحاظ سے بھی یہ بات معیوب سمجھی جاتی ہے کہ حکمران طاقت اور اختیار کی بنیاد پر صرف اپنے حق کی بات کی جائے اور دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کر دیا جائے۔

حضرت عمر فاروق کے یہ الفاظ بھی کافی قابل غور ہیں۔

''اے لوگوں میں تمھارے مالوں پر اس سے زیادہ حق نہیں رکھتا جو ایک ولی یتیموں کے مال پر رکھتا ہے تم میرے خلاف بہت سے حقوق رکھتے ہو جنھیں تم مجھ سے طلب کر سکتے ہو ان میں سے ایک حق یہ ہے کہ میں نہ تو محاصل یا مال غنیمت کو ناجائز طریقے سے حاصل کروں اور نہ انھیں ناجائز طریقے سے خرچ کروں اور دوسرا حق یہ ہے کہ میں تمھارے وضائف میں اضافے کی کوشش کروں گا اور سرحدوں کی حفاظت کروں گا اور یہ کہ میں تمہیں غیر ضروری خدشات وخطرات میں نہ ڈالوں گا''۔[21]

حضرت عمر فاروقؓ کے اس فرمان میں آج کے جدید حاکم کے لیے دو باتیں بہت غور طلب ہیں ان میں سے ایک بات تو یہ ہے اپنے حقوق سے زیادہ عوام کے حقوق کا خیال رکھنا اور عوام کے حقوق کا مطلب یہ ہے کی اپنی آرائش کو کم کر کے عوام کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا اور جو ریاست کا نظام محاصل ہے اس کی حفاظت کرنا نہ خود اس میں شاہ خرچی کرنا اور نہ کسی اور کو اس کی اجازت دینا اور دوسری اور بہت اہم بات یہ ہے کہ اپنی مراعات کی بجائے عوام الناس کے وضائف میں اضافہ کرنا اور بے روز گاری کا خاتمہ کرنا اور انھیں بنیادی سہولیات کا فراہم کرنا وغیرہ مگر آج ہم پاکستان میں دیکھتے ہیں کہ حاکم اپنے لیے نئے مراعات کے قوانین بنا رہا ہے اور زیادہ سے زیادہ سہولیات حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کا استحقاق رکھتا ہے اور جو غریب لوگ ہیں وہ غریب سے غریب تر ہو کر اپنی جانوں کا ضیاع اور فاقوں پر مجبور ہیں ان حالات میں حکمران اپنے استحقاقات کا استعمال ضرور کریں مگر اس میں عوام الناس کے حقوق کی بحالی، غربت کے خاتمیں اور انھیں بنیادی سہولیات فراہم کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کریں۔

نبی کریم ﷺ کی ایک عادل حکمران کی رعایا کے ساتھ مساوات کرنے کی نصیحت ان الفاظ میں ملتی ہے

مامن امیریلی امرالمسلمین ثم لایجهد لهم ولا ینصح الالم یدخل معهم فی الجنة۔[22]

"کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے۔ پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے جان نہ لٹائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً نہ داخل ہو گا"۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

من ولی لنا عملا ولم تکن له زوجة فلیتخذ زوجه ومن لم یکن له خادم فلیتخذ مسکناً اولیس له دابة فلیتخذ دابة' فمن اصاب سوىٰ ذٰلک فهوغال اوسارق۔[23]

"جو شخص ہماری حکومت کے کسی منصب پر فائز ہو وہ اگر بیوی نہ رکھتا ہو تو شادی کرلے، اگر خادم نہ رکھتا ہو تو ایک خادم حاصل کر لے، اگر گھر نہ رکھتا ہو تو ایک گھر لے لے' اگر سواری نہ رکھتا ہو تو ایک سواری لے کے اس سے آگے جو شخص قدم بڑھاتا ہے وہ زیادتی کرنے والا یا چور ہے"۔

اِن احادیث مبارکہ سے نبی کریم ﷺ کی عدالت کا پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ رعایا کے حقوق کے بارے میں کسی قدر انصاف سے کام لیتے تھے اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے

تھے۔رعایا کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے ایک بہترین طریقہ یہ ہے کہ حکمرانوں کے اختیارات پر نظر رکھی جائے۔

کسی بھی مملکت میں حاکم اور رعایا جرائم کی نوعیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالا تر نہیں چناچہ اس سے ہمیں قانونی مساوات کا تصور ملتا ہے ،جہاں تک قانونی مساوات کا تعلق ہے تواسلامی ریاست کی یہ بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ قانون کی عام حکمرانی قائم رکھے۔ہر شخص اور ہر طبقہ کے لوگ ایک ہی نظام عدالت کے تحت ہوں،غریب وامیر اور راعی ورعایا سب قانون کی نظر میں برابر ہونے چاہیں۔اسلامی ریاست قانونی مساوات کی علمبردار ہے اس لیے اسلامی ریاست کا کوئی شہری قانون سے بالا تر نہیں حتی کہ منتظم اعلیٰ بھی قانون سے مستثنیٰ نہیں۔

قانونی مساوات اور عدل وانصاف کی تکمیل کے حوالے سے ابن طباطبا لکھتے ہیں

''فرمانروا پر رعایا کا ایک حق یہ بھی ہے کہ کمزور کو قوی کی دست درازی سے محفوظ رکھے۔ادنی کے ساتھ اعلیٰ کے لیے مقابلے میں عدل کرے۔حدود کو قائم کرے۔ہر ایک کے حق کو اس کی صحیح جگہ دے۔داد طلب کی دادرسی کرے اور فریادی کی فریادرسی کرے۔قریب وبعید اور ادنیٰ واعلیٰ کے درمیان فیصلوں میں یکسانی قائم رکھے''۔[24]

قانونی نفاذ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ عدل وانصاف، قانونی مساوات اور احتساب کے نظام کو فعال بنایا جائے تاکہ ان حکمرانوں میں احساس ذمہ داری بھی ہو اور وہ ملک و قوم کی فلاح کے لیے کام کر سکیں۔جہاں تک حکمرانوں میں احساس ذمہ داری کا تعلق ہے تو اس بارے میں حضرت عمر فاروق کا قول ہے۔

لو ھلک حمل من ولد الضان ضیاعا بستاط الفراط خشیت ان یسالنی اللہ[25]

''دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا''۔

گویا اس سے بھی معلوم ہوا کہ جب بھی کوئی حاکم کسی منصب پر فائز ہوتا ہے تو اس کے اندر احتساب کا جذبہ بھی ہونا چاہیے ،کیونکہ اس کے پاس جو قومی اختیارات ہیں اس کے لیے وہ تمام اداروں اور عوام الناس کو جواب دہ ہے مگر پاکستان میں جو اعلیٰ حکام ہیں ان کے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں ہوتا اس لیے نہ وہ احتساب کے قوانین بناتے ہیں اور نہ ہی وہ جوابدہی کے تصور پر

عمل پیرا ہوتے ہیں۔اگر اب یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا کہ اب حالات بدل رہے ہیں عوام الناس میں ایک نیا شعور و ولولہ پیدا ہو گیا ہے اب حکام کے پاس ایسا کوئی چور راستہ نہیں بچتا کہ وہ اقتدار یا منصب سے الگ ہونے کے بعد کہیں غائب ہو جائیں بلکہ اب ان حکام کو عوام اور اداروں کے عدالت میں خود کو احتساب کے لیے پیش کرنا ہو گا۔لہذا یہ ایک اخلاقی تقاضا بھی ہے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تکمیل کے حوالے سے خود کو پیش کر دینا چاہیے تا کہ ریاستی ادارے اس بات کی وضاحت کر دیں اختیارات اور ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے پورا کیا گیا ہے۔اگر اس معاملے میں کہیں کوئی کوتاہی ہوئی ہے تو پھر قانون کی روشنی میں اس کی اصلاح کر لی جائے۔یہ ایک ایسا ضابطہ ہے جو آنے والے حکمرانوں کے لیے اقتدار اور اختیارات کے استعمال کی ایک اچھی مثال پیش کر دے گا۔

حکمرانی ایک ذمہ داری ہے جس کو پورا کرنا ہر حاکم کا فرض ہے اگر وہ اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرے گا یا اپنے اختیارات سے تجاوز کرے گا تو اس کے لیے اسے احتساب کے لیے تیار رہنا پڑے گا۔اس لیے حکمرانی کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر یہ صلاحیت بھی ہونی چاہیے جس سے وہ ملکی معاملات کو چلا سکے۔اس لیے ہمیں احادیث میں اس کی وضاحت ملتی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے حکمرانی کو طلب کرنے سے منع فرمایا۔

چنانچہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قال رسول اللہ ﷺ یا اباذر!انی اراک ضعیفا ، وانی احب لک مااحب لنفسی، فلا تامرن علی اثنین ، ولا تولین مال یتیم۔[26]

"حضرت ابو ذر سے روایت ہے،وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے فرمایااے ابو ذر!میں تمہیں کمزور دیکھتا ہوں ، اور میں تمہارے لیے وہی پسند کر تا ہوں جو اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔تم کبھی دو آدمیوں پر بھی امیر نہ بننا ، اور کسی یتیم کے مال ذمہ داری قبول کرنا"۔

احتساب ہی کے سلسلہ میں امام ابن جریر طبری اپنی کتاب تاریخ طبری میں لکھتے ہیں کہ

"حضرت عمر فاروقؓ کو کسی نے خبر دی کہ حضرت سعدؓ نے اپنے مکان کے سامنے ایک ڈیوڑھی بنا رکھی ہے۔جو ان کے اور عوام الناس کے مابین رکاوٹ کا موجب بنتی ہے۔یہ شکایت سنتے ہی حضرت محمدؓ بن مسلمہ کو کوفہ کی سمت دوڑایا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ اگر شکایت صحیح پائیں تو جناب سعدؓ سے ملے بغیر ڈیوڑھی کو آگ لگا دیں۔جناب محمدؓ بن مسلمہ کوفہ پہنچے۔شکایت درست پائی جناب

سعدؓ کے مکان کے آگے ڈیوڑھی واقعتا بنی تھی۔ حضرت محمدؓ بن مسلمہ جناب سعدؓ سے نہیں ملے۔ لکڑ یا ں منگوائیں اور ڈیوڑھی کے گرد پھیلا کر ڈیوڑھی کو آگ لگو ادی۔ جب ڈیوڑھی جل گئی تو جناب سعدؓ سے ملا قات کی اور ان کا بیان قلمبند کیا"۔[27]

اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ عام آدمیوں کے لیے بھی یہ سب ممنوع ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سلطنت کے ارکان میں طرز معاشرت کا یہ طرز عوام کے دل میں اپنی کمتری کے احساس کا سبب بنتا ہے۔ اگر دور جدید کے معاشروں پر نظر ڈالیں تو صدر کا عوام کے درمیان مل کر بیٹھنے کا تصور محال ہے یا حکام بالا تک اپنی التجا پہچانا بھی دشوار ہے جس کے بارے میں محض سوچا جا سکتا ہے اس کی جسارت نہی کی جاسکتی۔ ہمارے حکمرانوں کو بھی اخلاقی طور پر ایسا طرز عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس میں قانون کے ساتھ اخلاقی تقاضوں کی بھی تکمیل ہو اور وہ عوام الناس کے لیے خود کو بطور نمونہ بھی پیش کریں جیسا کے اسلامی تاریخ اس کی عملی مثال ہے۔

حضرت سعدؓ کے بارے میں ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کو یہ شکایت پہنچی تھی کہ ان کے پاس خاصی رقم جمع ہوگئی ہے ، محمدؓ بن مسلمہ کو حکم ملا کہ کوفہ پہنچیں اور حضرت سعدؓ سے حساب فہمی کریں۔ محمد بن مسلمہ کوفہ آئے حضرت سعدؓ کا حساب لیا۔ جناب سعدؓ نے جو روداد پیش کی اس میں بیان کیا تھا کہ ان کے ہاں جو دولت جمع ہوئی ہے۔ وہ ان غنیمتوں کا نتیجہ ہے جو جائز طور پرا نہیں میدان جنگ میں ملی ہیں۔ انہوں نے بڑے نامی گرامی دشمنوں سے لڑ کر ان کو ہلاک کیا ہے ۔ اور ان کے گلوں میں لٹکے ہوئے قیمتی ہاروں اور سروں کے تاجوں کے حقدار بنے ہیں اور کوئی بے ضابطگی نہیں کی ہے۔ اس کے باوجود حضرت عمر فاروقؓ نے ان سے آدھی دولت چھین لی اور یہ دولت خزانہ عوام میں شامل کر دی۔[28]

امام شعبی فرماتے ہیں کہ حضرت عمرفاروقؓ کا یہ طریقہ تھا کہ جب آپ کسی حاکم کو کسی صوبہ پر مقرر فرماتے تھے تو اس کے تمام مال و اثاثے کی فہرست لکھوا کر اپنے پاس محفوظ کر لیا کرتے تھے۔[29]

یہ ایک ایسا طریقہ تھا جو حکمرانوں میں احساس ذمہ داری کا جذبہ رکھتا تھا۔ ان کو معلوم تھا کہ ہم جس عہدے پر ہیں یہ ایک ذمہ داری ہے جس کے لیے ہم نے بالاخر جوابدہ ہونا ہے۔ آئین پاکستان میں بھی یہ موجود ہے کہ جب آپ خود کو عوامی نمائندگی کے لیے پیش کرتے ہیں تو آپ کو اپنے تمام اثاثہ جات بتانے ہوتے ہیں

مگر یہاں پاکستان میں انتخابی گوشواروں میں نہ صرف جھوٹ بولا جاتا ہے بلکہ خود کو آسودہ حال بنا کر پیش کیا جاتا ہے جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے حکمران اپنے سے زیادہ اپنے خاندان کے افراد کے نام پر مال دولت بناتے ہیں جو پھر مل جل کر کھاتے ہیں۔لہذا اخلاقی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوں ایسے مزاج کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے تاکہ اگر کوئی ایسا کام جو قانون کی نظر میں ٹھیک ہے تو وہ اخلاقی طور پر بھی درست ہونا چاہیے اور اسی سے تو مسلم حکمران کی پہچان ہونی چاہیے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے کسی بھی ترقی پذیر ملک میں سرکاری شاہی محل ، سرکاری گاڑیاں، تفاوتی تنخواہیں، شاہی سہولتیں، پروٹو کول اخراجات، شاہی محلوں پر مشتمل رہائشیں ، شاہی مزین دفاتر، سرکاری بے شمار خدمت گار وں کی فوج مہیا کرنے یا لا تعداد غیر ضروری سرکاری خزانے کے اخراجات کا عدل کش نظام مروج نہیں۔تمام مغربی ممالک میں صرف چار پانچ مرلے پر مشتمل سادہ کوارٹر نما گھر سیاستدانوں اور افسروں کو مہیا کیے جاتے ہیں۔تمام سیاسی حکمران اور سرکاری ملازمین پیدل ، سائیکلوں ، بسو ں پر دفتروں میں آتے جاتے ہیں۔بہت ہی کم سرکاری گاڑیوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔پاکستان میں ان حکمرانوں نے ملک کا نظا م عدل و انصاف اور اعتدال کے متضاد نافذ کر رکھا ہے۔ملک میں سرکاری گاڑیوں کی تعداد،حکمرانوں کے سرکاری محلوں کی تعداد اور تعیش اور بے شمار سرکاری سہو لتوں کا نظام نافذ العمل ہے۔ان کے شاہی دستر خوان، شاہی اخراجات اوران کے بچوں کے سکولوں ،کالجوں کی فیسوں اور اخراجات کا اندازہ لگا لو۔ان کے یہ اخراجات ان کی تنخواہوں سے زیادہ دکھائی دیں گے۔ان شاہ خرچیوں نے انہیں ہر قسم کی کرپشن کا عا دی بنا رکھا ہے۔رشوت، کمیشن،بریف کیس ما فیا، ان کی زندگیوں کا حصہ بن چکے ہیں جس کی طرف فی الفور توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اگر پاکستانی حکمرانوں کے طرز عمل پر طائرانہ نظر ڈالیں تو یہ کیسے حکمران ہیں جو ملکی خزانے کو مال غنیمت سمجھ کر لوٹتے رہتے ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ حکومت کے فرائض ادا کرنے کے لیے سیاست میں نہیں آتے، بلکہ اپنی تجارت ، اپنے کاروبار، اپنی جائیدادیں ، اپنے محل ، بڑی بڑی شوگر ملیں، لوہے کی ملیں، بڑی بڑی فیکٹریاں، بڑے بڑے کارخانے، اور اپنے ذاتی معاشی نظام کو بہتر سے بہتر کرنے کے لیے قو می خدمت گار بن کر ملک کے اقتدار پر براجمان ہو جاتے ہیں۔ملک کا زیادہ تر بجٹ حکمران اور ان کے کارندے مختلف مرا عات اور تنخواہوں کے ذریعہ ہضم

کر جاتے ہیں۔ موجودہ نظام انتخابات نے ہمیشہ اسمبلیوں میں بیشتر نااہل اور مفاد پرست افراد کو بھجوایا ہے جنہوں نے ملک وقوم کی خدمت کی بجائے اپنے ذاتی مفادات کا تحفظ کیا۔ ہارس ٹریڈنگ، رشوت، غبن، لوٹ مار، خیانت اور ناجائز طریقوں پر کروڑوں اربوں روپے کے قرضے لینا اور دھوکہ دہی سے ان قرضوں کو معاف کروانا ان اراکین کا معمول رہا ہے۔ گزشتہ ۲۰۰۸ تا۲۰۱۳پارلیمنٹ ممبران میں سے اکثریت نادہندہ تھی اور انہوں نے اپنے عزیزوں کے نام پر اربوں روپے معاف کروائے۔ یہی قرض پاکستانی عوام پر مہنگائی اور بدحالی کی صورت میں اضافی بوجھ کا سبب بنتے ہیں۔ لیکن ہمارے غریب عوام اس حقیقت سے واقف نہیں اور ہر بارخود تو بھوکے رہتے ہیں مگر ٹیکسوں کے بوجھ اور مہنگائی کو برداشت کرتے ہوئے زندگی کی سانسیں پوری کرتے چلے جاتے ہیں۔

جبکہ اسوہ رسول ﷺ سے معلوم ہوتا ہے کہ حاکم تو عوام الناس کا نگہبان ہوتا ہے جو ان کی جان و مال کی حفاظت کرتا ہے،اگر وہ اس کی ٹھیک طرح سے حفاظت نہیں کرے گا تو تو اس کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا۔ گویا اگر حاکم وقت پوری طرح اپنے فرائض انجام نہیں دیتا یا اپنے اختیارات سے تجاوز کرتا ہے تو اس کے لیے اسے جوابدہ ہونا پڑے گا۔

جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

ان رسول الله ﷺ قال الا کلکم راع وکلکم مسؤل عن رعیته فالامام الاعظم الذی علی الناس راع وهو مسؤل عن رعیته۔[30]

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آگاہ ہو جاؤتم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا پس امامحکم،امیر المؤنین لوگوں پر نگہبان ہے اور اس سے اس کی رعایا کے بارے میں سوال ہو گا"۔

گویااس سے معلوم ہوا کہ حکمرانی ایک ذمہ داری کانام ہے،جب یہ ذمہ داری تفویض کی جاتی ہے تو پھر اس ذمہ داری کو پورا کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اگر حکمران اس ذمہ داری کو پورا نہیں کریں گے تو اس کے لیے پھر ان کو جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اس لیے یہ ذمہ داری اہلیت کی بنیاد پر تفویض کی جاتی ہے، تاکہ ہر اہل شخص کو عوامی نمائندگی کے بعد احساس ذمہ داری بھی رہے، مگر پاکستان میں حکمرانی حق سمجھ کر لی جاتی ہے،اہلیت کو نظر انداز کیا جاتا ہے،عوام الناس پر اپنے فیصلے نافذ کیے جاتے ہیں اور حکمران خود کو ان قوانین سے مبرا سمجھتے

ہیں، جس کو قانونی زبان میں استثناء کا نام دیا جاتا ہے۔ گویا یہ ان کا بنیادی حق تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب عوام انھیں منتخب کر کے پارلیمنٹ کے ایوانوں میں بھیج دے تو پھر قانون انھیں ہر لحاظ سے تحفظ فراہم کرتا ہے اور یہ تحفظ اخلاقیات کے نام پر ان سے واپس نہیں لیا جاسکتا۔

خلاصہ بحث

یہ کتنا المیہ ہے کہ ہم نے یہ ملک خداداد اسلام کے نام پر حاصل کیا، اس کا مطلب یہ تھا کہ اس ملک کا نظم ونسق اسلامی اصولوں کے مطابق چلایا جائے گا۔ چناچہ جب ریاستی نظم ونسق میں عملی تقاضوں کی بات ہوتی ہے تو اسلام قانونی اور اخلاقی دونوں تقاضوں کی عملی تکمیل کی بات کرتا ہے اور اس کے لیے ہمیں قانونی مساوات، عدل وانصاف اور احساس ذمہ داری کی تعلیم دیتا ہے۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہو سکتا کہ ہم اسلامی طرز حکمرانی کا دعویٰ کریں اور پھر وضعی قوانین کے پس پردہ اپنے قانونی تحفظ کے طالب بھی بنیں۔ لہذا یہ عصری ضرورت ہے کہ حکمرانوں میں اتنی اخلاقی جرات ہونی چاہیے کہ اگر قانون اور عوام ان سے جوابدہی کا مطالبہ کریں یا ان کے طرز حکمرانی پر سوالیہ نشان لگائیں تو انھیں اس ذمہ داری سے سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ اگر وضعی قوانین کی روشنی میں وہ اس کے اہل ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ ان کا کردار ہی ان کے افعال کا تعین کرتا ہے، جب کردار اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو جائے تو پھر اس میں اخلاقی تبدیلی وقت کی ضرورت بن جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا معاشرتی رویہ ہے جس میں تبدیلی بھی وقت کی ضرورت ہے، اگر ہم قانون کے ساتھ ساتھ اخلاقی اقدار کو اپنی طرز زندگی کا حصہ بنالیں تو کوئی بعید نہیں کہ ہم عالمی دنیا میں اپنا طرز حیات بلند کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے بلکہ امین اور خوش حال ریاست کے قیام میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں، نفاذ قانون اور ریاستی نظم ونسق میں بھی سیاسی اخلاقیات کو اختیار کیا جائے تاکہ سیاست اور اخلاق کو برابری کی سطح پر لے جاکر ریاست کو مزید خوش حال بنایا جاسکے۔

سفارشات

۱۔ اخلاق کی ضرورت واہمیت کو معاشرے میں اجاگر کیا جائے

۲۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اخلاقی اقدار کو فروغ دیا جائے

۳۔ قانون سازی کرتے ہوئے اخلاق اور اخلاقی اقدار کو بھی مد نظر رکھا جائے

۴۔ نفاذ قانون میں قانون اور اخلاق کو برابری کی بنیاد پر رکھا جائے

۵۔ سیاست اور اخلاق ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں لہذا سیاسی طرز حیات میں بھی اخلاقی اقدار کو فروغ دیا جائے

۶۔ عام معاشرتی رویوں اور مزاجی کیفیات میں تبدیلی وقت کی ضرورت ہے اس کے لیے بھی اخلاقاور اخلاقی اقدار کو فروغ دیا جائے

۷۔ حکمرانوں کو اس طرف مائل کیا جائے ریاستی نظم ونسق میں اخلاقی اقدار کو اپنا معیار بنائیں

۸۔ حکمرانوں میں احساس ذمی داری پیدا کرنے کے لیے بھی اخلاقی تعلیمات کو عام کیا جائے

---

[1] Mehmood Ahmad Ghazi, Islami Riasat Asar-e-Hazir Main, Fikar-o-Nazar Islamabad 1983, V21, Issue 2, P 10

[2] Mustafa Samsuddin, Anwar-ul-Lughat, Jamia tul Iskandria, V1, P293

[3] Al Quraan, Al Qalam, 68:4

[4] Asfahani, Raghib, Mufirdat-ul-Quran, V 1, P 341

[5] Al Quraan, Al Baqrah,2:102

[6] Imam Muslim, Sahih Muslim, Bab Tafseer al-Bir Wal Ism, Hadith No 2553

[7] Imam, Bukhari, Al-Jame Al-Sahih, Kitab-ul-Manaqib, Bab Siffat-un-Nabi, Hadith No 3559

[8] Imam, Abu Dawood, Sunan Abu Dawood, Kitab al-Adab, Bab fi-Husn-ul-Khulq, Hadith No 4799

[9] Imam, Abu Dawood, Sunan Abu Dawood, Kitab al-Adab, Bab fi-Husn-ul-Khulq, Hadith No 4798

[10] Seoharwi, Hifz-ur-Rehman, Akhlaq aur Falsafa Akhlaq, Farooqi Press Dehli,1950, P 20

[11] Shah Wali Ullah, Hujat Ullah al-Baligha, P254

[12] Imam Gazali, Ihya Ulum al-Din,V3,P39

[13] Seoharwi, Hifz-ur-Rehman, Akhlaq aur Falsafa Akhlaq, P 20

[14] Ibid, P 24

[15] Imam Tibri, Muhammad bin Jarir, Tarikh al-Umum wal Malook (Tarikh Tibri), Beirut Labenan, V 1, P187

[16] Ibn-e-Taba Taba, Muhammad Ali bin Ali, Al-Fakhri, Translate by Muhammad Jafar Shah Phulwari, Idarah Saqafat Islamiya Lahore, P49

[17] Ibid, P 26

[18] Maqbool Arshad, Pakistan ke Arab Pati Khandan, Fact Publications Lahore, P257-258

[19] Ibn-e-Taba Taba, Muhammad Ali bin Ali, Al-Fakhri, P30

[20] Imam Ahmad bin Hanbal, Musnad Ahmad, Dar-e-Ahya ul-Tiras al-Arabi Beirut, Labenon, 1993, V2, P370, Hadith No 667

[21] Al-Haysami, Noor-ud-Din Ali Bin Abu Baker, Majma-uz-Zawaid wa Manba-ul-Fawaid, Researcher Muhammad Abdul Qadir Atta, Darul Kutub Al-Elmiya 2001, V5, P 186

[22]Imam Muslim, Sahih Muslim, Kitab-ul-Amarah, Bab Fazila-tul-Imam ul Aadil, V5, P124, Hadith No 1374

[23] Ali, Muttaqi, Kanz-ul-Ummaal, Hadith No 3466

[24] Ibn-e-Taba Taba, Muhammad Ali bin Ali, Al-Fakhri, P40

[25] Ali, Muttaqi, Kanz-ul-Ummaal, V5, P370, Hadith No 14294

[26] Ibn Aseer, Muhammad Bin Abdul Karim, al-Shebani Al-Jazri, Jame ul-Asool Fi-Ahadith Al-Rasool, Dar-ul-Kutub Al-Elmiya Beirut, V4, P 56, Hadith No 6

[27] Imam, Abu Yousuf, Kitab-ul-Khiraj, P65

[28] Ibid, P66

[29] Ibn-e-Saad, Tabqaat Ibn-e-Saad, V3, P 122-123

[30] Imam, Bukhari, Al-Jame Al-Sahih, Kitab-ul-Ahkam, Bab Qoul lillah ta'ala Ati-ullaha Wa'ati-ur-Rasool, Hadith No 7138